ہمچو ادھم بحرِ حق بایک پیالہ جستہ اَم　　مثلِ قرنی دُرِّ دیگر را تلاشے کردہ اَم

در شبیہم بر دیارت نسبتے آوردہ اَم　　بہر اُمت تحفہ نورِ جمالت بُردہ اَم

دُرِ عینی

حیات قبلہ باباعبید اللہ دُرانی مدظلہ العالیٰ

باب ۲

تعلیم

ابتدائی تعلیم اُن شہروں میں حاصل کی جہاں والد صاحب کا تبادلہ ہوتا رہا۔ اس زمانہ میں ہی دستکاری کا شوق تھا۔ بجائے بچوں کے ساتھ کھیل کود میں وقت گزارنے کے، تنہائی میں کارپنٹری کے سامان اور سائنس کے مشغلوں میں وقت گزرتا۔ میٹرک رسول کُنڈہ سے کیا اور اعلیٰ تعلیم کے لئے علی گڑھ بھیج دئے گئے۔ علی گڑھ کی مشہور فرسٹ ایر فول والی ایکٹویٹی کا ذکر کئے بغیر علی گڑھ سے روشناسی بھی مکمل نہیں ہوتی۔ ہر نئے طالب علم کو اس سے دوچار ہونا پڑتا تھا۔ علی گڑھ کی یہ برسوں سے رسم چلی آرہی تھی۔ قبلہ بھی اب اس کا لطف لے کر یوں بیان کرتے ہیں کہ اپریل کا مہینہ تھا۔ زیر آسمان سو رہا تھا۔ رسم یہ ہوتی ہے کہ گھڑے میں پانی بھر کر دو آدمی سوتے ہوئے نئے طالب علم کے سینہ پر رکھتے ہیں اور تیسرا آدمی ہاکی سے گھڑا توڑتا ہے۔ چنانچہ ایسا ہی قبلہ کے ساتھ کیا گیا۔ مگر قبلہ کی اُس زمانہ میں اتنی گہری نیند ہوتی تھی کہ کوئی خبر نہیں ہوئی۔ وہ لوگ تو گھڑا توڑ کر بھاگ کر چھپ گئے اور غالباً یہ سمجھے کہ شرم کے مارے یہ نیا طالب علم حرکت نہیں کر رہا ہے۔ قبلہ کو اس پانی کا علم اس وقت ہوا جب صبح کی ٹھنڈ لگی اور اپنا بستر پانی سے تر پایا۔ کہاں تو اتنی گہری نیند کا عالم کہ ایسی صحت اور دماغی سکون پر انسان رشک کرے اور کہاں اسی فرسٹ ایئر کی طالب علمی کے زمانہ میں جو نظر کسی حسن ازلی پر پڑی تو حال یہ ہوا کہ نیند غائب گھر سے کالج آتے جاتے گرلز کالج کے بھی ٹانگے گزرا کرتے تھے۔ ایک دن یہ حسب معمول کالج جارہے تھے، نہ کوئی کوشش تھی نہ اس طرف دھیان تھا۔ تانگے گزرنا معمول تھا۔ آج جو ایک تانگہ گزرا اور ہوا کے جھونکے نے جو چند لمحوں کے لئے پردہ اڑایا تو بس جیسے ایک برقِ نظر، برق تجلی سی گری۔ اسی ایک جھلک کا تصور ذہن پر جم گیا۔ بھوک، نیند سب غائب ہوئی۔ ایک اذیت ناک خاموشی طاری ہوگئی۔ دیکھنے والوں نے بیماری گردانا، نیند لانے کے لئے ڈاکٹر مارفیا کے انجکشن دیتے اس کے علاوہ دوسری دوا اس زمانہ میں رائج نہ تھی۔ ان انجکشنوں کے زیر اثر صبح کو اگر غنودگی بھی آتی تھی آنکھیں بند ہوتی تھیں مگر حِس اتنی تیز اس حالت میں بھی رہتی تھی کہ دور سے کسی آنے والے کی چاپ سنتے تو بتلا دیتے تھے کہ فلاں آرہا ہے۔ اسی زمانہ میں یار دوست پکڑ کے ہر دوار لے گئے وہاں ایک مہنت نے سونے کا آسن سکھایا۔ یہ ایک قسم کا یوگا کہہ لیجئے یا اپنے کو ہپناٹائز کرنا۔ مگر اس مشق نے یہ سہولت ضرور کر دی کہ جب بھی چاہیں اپنے پر نیند طاری کر سکتے ہیں۔ خواہ پانچ منٹ کے لئے ہو یا آدھ گھنٹہ کے لئے۔ چنانچہ اس طریقہ کو سیکھ کر قبلہ اپنے ساتھیوں کو بھی اپنے اوپر نیند طاری کر لینے کا مشاہدہ کرایا کرتے تھے۔ یہاں تک کہ سڑک کے کنارے یا کنکریوں تک پر لیٹ کر اپنے اوپر نیند طاری کر لیتے اور اسی طریقہ سے... بعد کی زندگی میں سخت سے سخت تھکن کے عالم میں بجائے انجکشنوں کے قبلہ نے یہی طریقہ اختیار کیا۔

یہ شوقِ تجربہ اور تجسس قبلہ کی زندگی کا سرمایہ بنا ہوا ہے۔ طالب علمی کے زمانہ میں ہی ایجادات و اختراعات کا شوق۔ پھر اس میں اتنا انہماک کہ گھنٹوں ایسے تجربات یا چھوٹی چھوٹی ایجادات میں لگے رہنا، ایک اندرونی اضطراب اور محرک نمودِ حیات کی عکاسی تھی۔

علی گڑھ میں ہی قبلہ کو ڈی این ملک ڈی ایس سی جیسا معلم مل گیا جنہوں نے اپنے اس ہونہار شاگرد کی خفیہ صلاحیتوں کو بھانپ لیا اور قبلہ کی دلچسپیوں کا رُخ خالصتہً سائنس کی طرف موڑ دیا۔ علی گڑھ کی تعلیم کے دوران قبلہ نے خدا کی ریاضی مساوات ترتیب دے کر اپنے استاد ڈاکٹر ملک کو

دکھائی تو ڈاکٹر صاحب نے کہا کہ یہ سب کیا ہے میں تو اسے نہ سائنس سمجھتا ہوں نہ مذہب۔ لیکن قبلہ کو اب بھی یقین ہے کہ انسان حقیقت کا شعور محض ریاضی کی وساطت سے ہی حاصل کر سکتا ہے۔ قبلہ کا کہنا ہے کہ فزیکل اسٹرانامی یا اٹامک فزکس کے عمیق مطالعہ سے انسان بہت کچھ قدرتِ کاملہ کا عرفان کر سکتا ہے اور اس سے بھی کہیں زیادہ خود اپنے جسم میں دیکھے، فزیالوجی کا مطالعہ کرے تو نہ صرف حیرت اور حیرت میں اضافہ ہوتا جائے گا بلکہ ساتھ ساتھ اس کی عاجز عقل بھی، اس سحر آمیز کار فرمائی قدرت میں، کُن کی وہ نمود دیکھے گی کہ وہ یقین در یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہے کہ ہاں ہے ایک ذاتِ مطلق اور یقینی ہے۔

قبلہ کی طالب علمی کے زمانے کے ایک ساتھی کا کہنا ہے کہ میری ملاقات قبلہ سے اس وقت ہوئی جب وہ تھرڈ ایئر کے اسٹوڈنٹ تھے۔ عام طور پر قبلہ کے ساتھ چھٹیوں میں زیادہ وقت گزرتا جس کا سبب دونوں کا موسیقی سے لگاؤ تھا۔ ایک صاحب پشاور سے حبیب اللہ نامی بھی اکثر آجاتے تھے۔ دن بھر یا تو موسیقی سے شغف ہوتا رہتا یا پھر شطرنج جمی رہتی۔ چولہے پر چائے پکتی رہتی۔ تھوڑی تھوڑی دیر بعد چائے کا دور چلتا رہتا۔ یہ چائے بھی خاص قسم کی تھی جو شروع میں گولیوں کی شکل معلوم ہوتی لیکن دودھ میں پکتے پکتے ہلکی گلابی ہو جاتی اور گولیاں کھل کر پوری پتیاں بن جاتیں۔ قبلہ کی حالت عام طور پر اس قسم کی رہتی تھی کہ اکثر احباب انہیں سنکی سمجھتے تھے۔ کھوئی کھوئی سی حالت۔ پڑھائی سے بہت کم شغف اور بعض دفعہ کالج جانے کی بجائے کمرہ میں بند ہو کر بیٹھ جاتے۔ گرمی کی چھٹیوں میں گھر جاتے لیکن کافی چھٹیاں باقی رہتیں کہ واپس آجاتے اور زیادہ تر وقت کمرہ میں بیٹھ کر ہی گزارتے۔ فوٹو گرافی، مصوری اور باغبانی سے کافی لگاؤ تھا۔ اُسی زمانہ میں ایک تصویر بنائی تھی جس میں دل کھلا ہوا دکھایا تھا اور دل کے اندر ایک شمع روشن تھی۔ پہلو میں غالب کا ایک شعر تحریر تھا۔

اک نو بہارِ ناز کو تاکے ہے پھر نگاہ

چہرہ فروغِ مے سے گلستان کئے ہوئے

قبلہ کے اکثر فعل عام لوگوں سے بالکل علیحدہ تھے۔ وہ محویت کا علم۔ گمشدنی سی حالت اکثر طاری ہو جاتی جیسے اس جسمانی زندگی کے ساتھ ساتھ کسی دوسری سطح پر بھی زندگی گزر رہی تھی اور وہی اصل زندگی تھی اور یہ ظاہر کی زندگی سب ایک کھیل، ایک دکھاوے کی بات۔ ایک دن جون کی سخت گرمی میں دوپہر کے بارہ بجے شطرنج کھیلنے کے دوران کہنے لگے چلو یار ایک جگہ چلتے ہیں۔ اُن صاحب نے کہا بھی کہ اس گرمی میں؟ کہنے لگے بس چلے آئو چنانچہ دونوں چل دیئے۔ چلتے چلتے جنگل میں کچے قلعے پہنچ گئے۔ دس قدم آگے قبلہ اور پیچھے پیچھے یہ صاحب۔ قلعہ پہنچ کر قبلہ کھائی میں اتر گئے۔ اُن صاحب کو بھی اُترنا پڑا اُن کی حالت گرمی، حبس اور کھائی کے گرم پانی کی وجہ سی ابتر سی ہونے لگی۔ قریب سے کبھی کوئی سانپ نکل جاتا اور کبھی کوئی چھوٹا جانور۔ محسوس ہوتا تھا جیسے کوئی غیبی کشش انہیں، قبلہ کے ساتھ کھینچے لئے جا رہی تھی۔ اُس کھائی کی یہ چہل قدمی تقریباً ڈیڑھ گھنٹہ اس دھوپ اور لُو کی شدت میں جاری رہی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے قبلہ کو کسی خاص چیز کی تلاش تھی۔ تھوڑی دیر بعد کھائی سے نکل کر واپس چل دیئے اور کمرے میں آگئے یہ کمرہ پھونس کے بنگلے کے ایک کونے میں تھا جو ظہور وارڈ کے ڈائننگ ہال سے متصل تھا تمام سفر کے دوران قبلہ نے کوئی بات نہ کی۔ واپس پہنچ کر چائے پی گئی اور پھر سے شطرنج شروع ہو گئی۔

قبلہ کی یہ مجنونانہ کیفیت کچھ بڑھتی ہی گئی۔ یہاں تک کہ بی۔ ایس۔ سی کا امتحان احباب نے بڑی ضد اور زبردستی کر کے دلوایا۔ بی۔ ایس۔ سی کر کے قبلہ نے کچھ ایجادات گورنمنٹ آف انڈیا کو پیش کیں اور وہ اعلیٰ تعلیم کے لئے انگلستان بھیج دیئے گئے۔ ۱۹۳۸ء میں اُن صاحب کی قبلہ سے پھر ملاقات ہوئی۔ بہت خوش ہوئے اور فرمایا اچھا ہوا تم مل گئے اب ہم مل کر انجینئرنگ کالج بنائیں گے۔ ان صاحب نے کوئی توجہ نہ دی۔ ''مگر تقریباً ہر ملاقات میں کالج کا ہی ذکر ہوتا تھا اور قبلہ اصرار کرتے کہ سرکاری ملازمت لکھنؤ والی چھوڑ دو اور قوم کی خدمت پر کمربستہ ہو جاؤ۔ وہ صاحب شروع شروع میں تو ٹالتے رہے مگر بعد میں اس نیک مقصد کے لئے بیعت کر لی۔ ابتدائی مراحل میں پریشانیاں اٹھانی پڑیں لیکن رفتہ رفتہ امیدیں بندھتی گئیں اور بالآخر ڈیپارٹمنٹ آف ٹیکنالوجی قائم ہوا جو رفتہ رفتہ بڑھ کر کالج آف انجینئرنگ کہلایا۔ ایک اور صاحب پرنسپل مقرر ہوئے۔ ان کا برتاؤ قبلہ اور ان صاحب سے بہت بُرا تھا اور ایک مرتبہ تو بات اتنی بڑھی کہ ان صاحب نے قبلہ سے کہا کہ میں اب زیادہ برداشت نہیں کر سکتا۔ قبلہ نے فرمایا قوم کی خدمت قربانیاں چاہتی ہے۔ میں ان بداخلاقیوں کے باوجود خوش ہوں کہ جو پودا ہم نے لگایا ہے وہ پروان چڑھ رہا ہے اور آگے چل کر تناور درخت بن جائے گا۔ پھر نئے پرنسپل عبدالرحمن آئے۔ کچھ عرصہ بعد وہ بھی چلے گئے۔ اس کے بعد ایک قابل انگریز ٹی۔ ایچ۔ میتھیو مل پرنسپل ہوئے اب وہ پودا، تناور درخت بن چکا تھا۔ گورنمنٹ آف انڈیا سے سندات دینے کی منظوری مل چکی تھی۔

اس زمانہ میں قبلہ کی ساری تنخواہ، ان صاحب کی تحویل میں رہتی تھی اور یہ ان کی ہدایات کے مطابق اس میں سے خرچ کرتے رہتے تھے۔ انہیں اچھی طرح یاد ہے کہ تنخواہ کا آدھے سے بھی کم حصہ قبلہ کی اپنی ذات پر خرچ ہوتا تھا اور باقی حصہ امداد پر خرچ ہوتا تھا اس سارے زمانے میں قبلہ پر ایک عجیب کیفیت طاری رہتی تھی۔ وہ اپنے ماحول اور لباس وغیرہ سے قطعاً بے پرواہ نظر آتے تھے۔ اور اکثر ٹوک کر لباس تبدیل کرایا جاتا تھا۔ ایک دن ان صاحب نے تذکرۃً کہا کہ آپ فلاں شخص کی امداد کرتے ہیں جو عقائد کے لحاظ سے دہریہ ہے۔ فرمانے لگے۔ میں جانتا ہوں لیکن اگر تم کھانا کھا رہے ہو اور کوئی بھوکا کتا تمہارے سامنے آکر بیٹھ جائے تو تم کیا کرو گے۔ ان صاحب نے کہا کہ اگر کھانا باقی ہے تو ایک ٹکڑا اس کو بھی ڈال دوں گا۔ اِس پر فرمانے لگے کہ پھر وہ تو انسان ہے اور کُتے سے افضل ہے۔

اس زمانے میں قبلہ نے خاکسار تحریک میں بھی نمایاں حصہ لیا اور جب خاکسار برسرِپیکار تھے تو اکثر رات کو قبلہ کے یہاں قیام کرتے اور دوسرے دن آگے روانہ ہوتے۔ ہومیوپیتھی کا سلسلہ بھی جاری رہتا۔ قُرب وجوار میں جا کر مفت دوائیں تقسیم کرتے۔ گھر پر بھی شام کو مریضوں کا ہجوم رہتا تھا۔ کوٹھی پر اکثر موسیقی کی محفلیں منعقد ہوتیں۔ ایک مرتبہ تو بہت ہی مشہور ستار نواز تشریف لائے۔ کھانے کے بعد قبلہ نے اُن سے فرمائش کی۔ سوال یہ تھا کہ طبلے پر سنگت کون کرے گا۔ ان صاحب سے فرمایا۔ لو طبلے سنبھالو وہ عرض کرنے لگے کہ میں بے استاد۔ آخر اتنے بڑے استاد کا ساتھ کیسے دے سکوں گا۔ فرمایا ''بسم اللہ کرو''۔ ساز چھڑے اور ایسا رنگ جما کر وہ صاحب آج تک حیران ہیں کبھی کبھی قوالیوں کی محفل بھی ان صاحب کے ہاں جمتی جس میں قبلہ ہمیشہ شریک ہوتے اور جب تک قوالی ہوتی رہتی سر جھکائے استغراق میں رہتے۔

علی گڑھ میں ایک نیم پاگل کے ساتھ قبلہ کا چھ ماہ ساتھ رہا۔ اُس نے علی گڑھ کی تمام لائبریریاں چھان کر ایک بڑی سی کتاب لکھ ڈالی تھی جس میں پردہ کے رواج اور بے پردگی کا تعلق قوموں کے عروج وزوال کے ساتھ ثابت کیا تھا۔ ایک دن یہ شخص غسل خانہ میں گنگنا رہا تھا۔ قبلہ نے اُس سے کہا کہ گانا سنائو۔ وہ راضی ہوا۔ دونوں آبادی سے دُور ایک اجاڑ میدان میں چلے گئے۔ ایک منڈیر پر بیٹھ کر اُس نے راگ الاپا۔ بارش کے موسم میں، سورج غروب ہونے کا وقت، وہ شفق کی خوں افشانی، حساس روحوں کے لئے ایک وجدانی حالت، ایک جسم و جان میں اضطرابی کیفیت پیدا کرنے کے

لئے خود ہی کیا کم تھی۔ اس شخص نے مغرب کی جانب اس مسحور کن فضا کی طرف رُخ کر کے، مالکوس کا الاپ شروع کیا۔ صرف ساز، اور اس عالم میں بجاتا رہا بجاتا ہی رہا۔ قلب و روح کے چشمے اُبل پڑے۔ آنکھیں بند۔ ماحول اور وقت سے بھی بے نیازی۔ زمان، مکان کی بندشوں سے آزادی۔ بہت دیر بعد یہ ساز رکا۔ اندھیرا چھا چُکا تھا۔ اسی مدہوشی کے عالم میں دونوں گھر واپس لوٹے۔ اس شخص کی تو یہ کیفیت ہوئی کہ گھر آ کر خون اُگلنے لگا اور قبلہ کی یہ حالت کہ جیسے اس تمام راگ، اس تمام الاپ میں سے خود گزرے ہوں۔ وہ تخلیق کائنات سے پہلے جو تخلیق کی تکلیف تھی یا جیسے ماں بچہ جننے سے پہلے ایک تکلیف سے گزرتی ہے۔ پھر اس کے بعد ایک نظامِ حیات کا آنا۔ زندگی کی نمود۔ نغمۂ حیات کی سحر آفرینی۔ حُسنِ ازلی کی پردہ کشائی۔ قبلہ کا کہنا ہے کہ یہ چیزی میں نے اُس پاگل سے محسوس کی۔ خود اس کیفیت میں سے گزر کر۔ یوں تان سین کی بابت بہت کچھ مشہور تھا۔ بہت کچھ کرتا تھا۔ مگر یہ تخلیق اوّل تک رسائی، وہ کن۔ وہ اس کی پہلی نمود اور اس کی کیفیت میں ہو کر قبلہ کا یہی کہنا ہے کہ اس میں سے گزر کر مَیں یہی کہہ سکتا ہوں کہ یہ غم کی کیفیت تھی۔ دُکھ درد کی نہیں بلکہ غم کی۔ وہ غم ماں کی مامتا کی طرح۔ عالم گیر غم۔ اس غم کے گہرائیوں میں جیسے قبلہ کی روح فطری طور سے بیدار رہتی تھی۔ قبلہ سائنس کے طالب علم تھے مگر مکینکس کی کتاب کے سرورق پر میرؔ کا ایک شعر درج تھا وہ یہ تھا۔

غم کے ٹھوکے کچھ ہوں بلا سے آ کے جگا تو جاتے ہیں

ہم ہیں مگر وہ نیند کے ماتے جاگتے ہی سو جاتے ہیں

یہ کتاب ولایت تعلیم حاصل کرنے کے زمانے میں قبلہ کے ساتھ رہی۔ لاشعوری طور پر اس لئے بھی کہ غم سے یہ ازلی نسبت اسی شعر کے ذریعہ تازہ ہوتی رہے۔

غالبؔ کی شاعری سے قبلہ کو خصوصی لگاؤ تھا۔ اردو بہت کم آتی تھی اس لئے بسا اوقات دوسروں سے معنی پوچھتے اور اشعار گنگناتے رہتے۔ یہ شوق رفتہ رفتہ اتنا بڑھا کہ غالبؔ کا انگریزی میں ترجمہ کرنے کا سوچا۔ اس کا بیشتر حصہ انگلستان کی تعلیم کے زمانہ میں لکھا گیا۔ یہ ترجمہ ابو الخیر کشفی صاحب کو نظر ثانی کے لئے دیا گیا۔ مگر تقسیم ہند اور قبلہ کی بیماری۔ لوگوں کے نقلِ وطن اور اس پُر آشوب زمانہ میں کہیں ضائع ہو گیا۔ قبلہ کا فرمانا ہے کہ غالبؔ سلطنت مغلیہ کے زوال کا وہ آنسو تھا جسے حیات و موت کی برزخ کہہ لیں۔ غالب کی ہستی میں مغلیہ دور سمٹ کر جمع ہو گیا تھا اور اس کا مقام قلب اور روح کے درمیان ایک برزخ تھا۔

قبلہ کو اللہ نے ایک صحت مند جسم اور بیدار روح عطا کی تھی جو پوری زندگی کو ایک کُلّی توحیدی انداز میں مصروف عمل رکھتی۔ دور خی یا منتشر شخصیت کی اس فطری سادگی میں کوئی گنجائش نہ تھی۔ جو کچھ اندر تھا وہی باہر۔ بچہ کی طرح ایک کُھلی کتاب۔ کسی قسم کی دوئی سے ناآشنا اور یہی تابندگی تمام آئندہ زندگی کو بھی احاطہ کئے رہی جس کا اظہار دیکھنے والوں نے ہمیشہ قبلہ کی آنکھوں کی چمک میں پایا۔ جیسے کائنات کی ہر لطافت ان ہی آنکھوں میں سما گئی ہو۔

اس کم عمری کے زمانے میں ہی قبلہ نے ایک ایسا ڈبہ ایجاد کیا تھا جسے اگر چور کھولنے کی کوشش کرتا تو اس کے ہتھکڑی لگ جاتی اور اٹھا کر بھاگنے کی کوشش کرتا تو ڈبہ میں سے مرچیں نکل کر اس کی آنکھوں میں پڑ جاتیں۔

علی گڑھ کی طالب علمی کے زمانے میں ریڈیو اور برقیات پر برابر تجربے کرتے رہتے اس میں پروفیسر خلیل مراد صاحب مرحوم نے کافی ہمت افزائی بھی کی تھی اور خود اپنی بنائی ہوئی چیزیں دکھا کر طلباء میں یہ شوق پیدا کیا تھا۔ اسی کا نتیجہ تھا کہ قبلہ کے فطری جذبۂ تجسس و تحقیق کو اور تازیانہ ملا۔ اسی زمانہ میں قبلہ کو ایجادات کا شوق ہوا اور کئی تجربوں میں اصلاحی طریقہ کار کر کے دکھایا جس پر لکھنؤ یونیورسٹی کے وائس چانسلر اور ماہر طبیعات ڈاکٹر ولی محمدؒ سے بارہا تحسین حاصل کی۔

قبلہ کی ایک ممتاز اختراع وہ جادوئی ڈبہ تھا جس میں چابی نہ تھی اور کسی خاص فرد یا اُس کے گھر کے کسی شخص کی آواز پر کُھلتا تھا۔ اس ایجاد پر گورنمنٹ آف انڈیا نے انہیں پانچ سال کی سکالر شپ دی اور شیفیلڈ سے انہوں نے الیکٹریکل انجینئرنگ کا امتحان پاس کیا۔ پھر انگلستان میں دو سال انگلش الیکٹرک کمپنی اسٹیفرڈ میں فنی تجربہ اور ٹریننگ حاصل کی۔ مالا کنڈ ہائیڈرو الیکٹرک اسکیم اسی زمانہ میں بنی تھی اور قبلہ نے بھی اُس پر کام کیا تھا۔ آپ یہ سُن کر حیران ہوں گے کہ موٹروں کے سگنل ان ہی دُرانی صاحب کی اختراع ہے۔ یہ اس وقت کی بات ہے جب وہ شیفیلڈ میں تعلیم حاصل کر رہے تھے۔ اسی اختراع کی بنیاد پر انگلینڈ میں موجودہ سگنل وضع کئے گئے۔ سروے کے بعض آلات بھی اسی زمانے میں قبلہ درانی صاحب نے وضع کئے۔

ولایت کی زندگی کی بابت قبلہ کے تاثرات یہ تھے کہ ابتداء میں تو بڑی کربناک تنہائی محسوس کرتا رہا لیکن بالآخر اس تنہائی کو ختم کرنے کے لئے موسیقی اور آرٹ میں پناہ لی اپنے ہاتھ سے ستار بھی بنائے اور اس طرح حضرت امیر خسرو ان کے رگ وپے میں بس گئے خسرو کے وہ اندرونی سوز اور باہر وہ شوخی وہ سادگی وہ زندگی کی دمک کہ ظاہر بیں نگاہیں اس غم کی گہرائیوں کو کیا پاتیں جو غمِ جاناں بنا ہوا تھا۔ اسی سوز کی بابت حضرت نظام الدلین اولیاء نے فرمایا تھا کہ کاش مجھے خسرو کا سوز مل جائے اور میری ساری ولایتیں خسرو کو عطا ہو جائیں۔ قبلہ نے خسرو کے اس سوز کو ایسا اپنایا کہ یہ مشغلہ آگے چل کر ان کی شخصیت کا ایک اہم جزو بن گیا۔ ہندوستان واپس آئے تو اکثر آل انڈیا موسیقی مقابلوں اور فنی نمائشوں میں قبلہ کو جج بنایا جاتا رہا اور یہی کچھ پشاور میں ہوا کہ انجینئرنگ اور سائنسی مقابلوں کے علاوہ موسیقی، فنی نمائش، پینٹنگ اور بحث مباحثوں میں اسی ذوق کی بنا پر مانگ ہوتی رہی۔

علی گڑھ آنے سے قبل ہی جب میٹرک کے طالب علم تھے تو بزرگوں اور نبی کریمؐ کی سوانح حیات میں دلچسپی اس درجہ بڑھی کہ باطن کی دنیا پلٹ گئی۔ ظاہر میں عم، تعلیم، دنیا کے کاموں میں گھِرے ہوئے اور باطن میں ایک حساس دل، ایک روحانی اضطراب، ایک ہیجان کا عالم۔ سوزِ دروں بڑھتا ہی گیا۔ کائنات کی حقیقت، اپنی حقیقت کی تلاش کا جذبہ وہ شدت اختیار کر گیا کہ دینی مجلسوں میں یا ہندوئوں کے مذہبی جلسوں میں بھی شامل ہو جاتے یا پھر اکثر تنہا بیٹھ کر خاموشی کے عالم میں سوچا کرتے۔ اسی کا نتیجہ تھا کہ آنکھوں میں وہ گہرائی پیدا ہو چکی تھی جو ایک غواصِ حقیقت کو عطا ہوتی ہے۔ علی گڑھ کی طالب علمی کے زمانے میں یہ کیفیت اکثر و بیشتر رہتی۔ پھر اس پر ایک سائنسی تحقیق و تجسس کا قدرتی شوق، جہاں آفاق کے عالم میں، علومِ ظواہر کے تجربے یا اعمالِ ظاہر کی مشق ہو رہی تھی۔ وہاں انفُس کے عالم میں، اپنی خودی کی پہچان اپنی باطنی صلاحیتوں کے عرفان کا شوق، طرح طرح سے پورا کرنا چاہا۔ جس کی زندگی ایک تیز دھارے پر بہہ رہی ہو یا بال سے زیادہ باریک پُل صراط پر سے گزر رہی ہو اسے یہ بھی ہوش کہاں ہو سکتا ہے کہ اپنے ان باطنی تجربات کو بیان میں لائے یا دوسروں کو سمجھا سکے۔ مثلاً یہ دیکھنے کے لئے کہ حواسِ خمسہ کو کہاں تک دبا سکتا ہوں آٹھ آٹھ روز تک کھانا نہ کھاتے۔ غالباً طبیعت کی یہ شدت اُس جذب اور عشق کو پھٹ پڑنے کے لئے مجبور کر رہی تھی جس کو اب تک راہ نہ ملی تھی۔

کچھ ایسی ہی شدتوں کی بات تھی جسے روح کی بے قراری کو راہ نہ ملنا کہہ لیں یا ناکامیٔ عشق کہہ لیں، یا روح کی حاکمیت عالمِ اجساد پر ثابت کرنا کہہ لیں کہ ایک دن سائنس لیبارٹری سے کافی مقدار میں پوٹاشیم سائنائڈ ہتھیلی پر رکھ کر پھانک لیا۔ سائنسی اور ڈاکٹری دنیا کا اسے کرشمہ ہی کہہ لیں کہ آج تک وہ زہر اس جسم پر اثر نہ کر سکا۔

تاج بابا کے پاس جب ناگپور پہنچے تو فرمایا "ارے کیا اس دنیا میں اپنی مرضی سے آیا تھا جو سمجھتا ہے کہ اپنی مرضی سے یہ دنیا چھوڑ سکتا ہے۔" قبضۂ قدرت میں اپنی زندگی اور وجود کے ہونے پر اس طرح ان مبارک ہستیوں کے ایمان کی تکمیل ہوتی ہے جو کسی کے دامن سے منسلک ہوں۔"

یہ اور اسی قسم کے بہت سے واقعات میں سے جب انسان اپنی روح اور جسم کو صحیح و سالم لے کر گزر آتا ہے۔ تب ہی وہ مقامِ روح میں قدم رکھنے کا حقدار ہوتا ہے۔ حیات اور موت کے چکروں سے نکل چکا ہوتا ہے۔ ایک موت ہی کیا، لگاتار موتیں۔ ایک زندگی ہی کیا، لگاتار زندگی کے رازوں سے آشنا ہو کر ہی انسان حقیقت کے میدان میں قدم رکھنے کا اہل ہوتا ہے۔

باطنی دنیا میں یہ ہیجان برپا تھا اور ظاہر کی دنیا میں وہی شوخی، سادگی، زندگی کی اُٹھان۔ شکار کا شوق ہوا تو اکثر ڈاکٹر ضیاء الدین صاحب کے ساتھ شکار پر جایا کرتے۔ ڈاکٹر صاحب کے پاس جرمنی کی بنی ہوئی ہیر ٹریگر والی بڑی نفیس رائفل تھی جو قبلہ کو دے دیا کرتے تھے۔ ایک دفعہ نیل گائے کے شکار پر گئے۔ ایک گھنی جھاری کے کنارے پر جب قبلہ مُڑے تو دیکھا کہ بمشکل آٹھ دس گز پر ایک ترنیل گائے سامنے کھڑا ہے۔ اُس کے حُسن کا اتنا رعب پڑا کہ قبلہ تکتے ہی رہ گئے۔ کہاں کی رائفل، کہاں کا شکار۔ جب حُسن ازلی اپنے چہرہ سے نقاب ہٹالے تو دید کی مجال کہاں رہتی ہے۔ نازک اور حساس دل کائنات کی ان ہی لطافتوں اور حسین لمحوں میں حُسنِ ازلی کا عرفان کرتے ہیں۔

اسی لڑکپن اور جوانی کے زمانے میں شکار میں ایک بار یوں ہوا کہ بھوپال کے جنگل میں ایک ہرنی شکار کی۔ جب ذبح کرنے کے لئے لوگ پہنچے تو ہرنی کے تھنوں سے دودھ بہہ رہا تھا۔ یہ دیکھ کر قبلہ کا حساس دل لرز اٹھا۔ وہ بچہ، وہ ماں۔ اس لئے وہ دن اور آج کا دن پھر نہ شکار کو ہاتھ لگایا، نہ دوسرے کا شکار کرنا پسند کیا۔

اسی لڑکپن کے زمانے سے تمام عمر، خود ہاتھوں سے کام کرنے اور ہنر سیکھنے کا شوق ایسا چڑھا کہ جوتوں کی مرمت، جلد سازی، تالے بنانا، کار پنٹری، بجلی کے سامانوں کی درستگی، مشینوں کی درستگی میں ہمیشہ اپنے کو مشغول رکھا۔ اسی شوقِ انہماک میں ایجادات اور اختراعات میں دلچسپی ہمیشہ قائم رکھی۔ دل بہ یار دست بہ کار کو اپنی روزمرہ زندگی کا اصول بنالیا اور آئندہ زندگی کے ہر دور میں اسی اصول پر اپنے فقر کی بنیاد رکھی۔ اس طرح قلب و روح پر جو واردا تیں گزریں اُن کی شدتوں میں جسم بھی وحدتِ زندگی کا نقشہ بن کر پیش ہوتا رہا۔ جو کام کیا وہ چھک کر کیا۔ قبلہ اب بھی اکثر فرماتے ہیں کہ مرد وہی ہے کہ فقر اندر ہو مگر ہاتھ میں ہنر ہو تاکہ روزی خود کمائے۔ یہاں تک کہ اعلیٰ علم حاصل کرنے یا پیشہ ورانہ صلاحیتوں میں ید طولیٰ رکھتے کہ علاوہ معمولی ہنر آتا ہو تو دو پیسہ کہیں بھی کسی حالت میں کما سکتا ہے؟ اور دوسروں کے کام بھی آسکتا ہے۔ جسم و قلب و روح کے اس جوشِ نمود میں قبلہ کی فطری، باطنی صلاحیتوں کو توحید عمل پیرائی کے نئے نئے مواقع ملے۔ باغبانی کا شوق، پینٹنگ کا شوق۔ خدمتِ خلق غریبوں کی دیکھ بھال، مریضوں کو دوا وارد، خاکسار تحریک میں عملی حصہ، بزرگانِ دین سے ملاقاتیں، علمی و اَدبی جلسوں میں خصوصی دلچسپی، کتب بینی، تصوف کے مسائل، الغرض روز مرہ زندگی کی ہر ادا کو، اپنی راہِ حقیقت کی تلاش میں وحدتِ حیات میں عمل پیرائی کا ذریعہ بنائے رکھا۔ دین و دنیا کو ایک ہی توحید میں اپنایا۔ اس طرح

حقیقت بینی یعنی حقائق پر نظر رکھنا، ہر چیز کے باطن، ہر چیز کے عینِ معنی پر نظر رکھنا عادتِ ثانیہ بن گئی۔ اسلام بھی حقیقت بینی کا سبق دیتا ہے۔ آسمانوں میں خیالی پرواز کرنے کی بجائے ہر چیز کی بنیاد اور اصل پر نگاہ رکھنے کا سبق دیتا ہے تاکہ قدم ہمیشہ زمین میں رہیں اور ہر شے کی بنیاد یا جڑ، زمین میں ہی دیکھنے کی عادت رہے۔

اسلام کا دوسرا سبق جمیعت بندی ہی جانِ اسلام ہے اسی لئے قبلہ نے کبھی تنہا عروج حاصل کرنے یا اعلیٰ مدارج حاصل کرنے کی انفرادیت میں اپنے کو گرفتار نہ کیا بلکہ حسنِ حقیقت کو جمعی وحدت میں اپنانے کی کوشش کی اور اس طرح جمیعت کے رنگ، الخلق، عیال اللہ کے انداز کو پاکر ہمیشہ مقصدِ تخلیق سے ہم آہنگی قائم رکھی۔ اسلام کا تیسرا سبق خالق سے رابطے کا طریقہ خدمت خلق ہی تو تھا۔ اس میں اپنی ساری زندگی وقف کر دینے کی ٹھان لی اور چوتھا سبق فروغِ ملت ہمیشہ نصب العین بن کر تازیانہ کا کام دیتا رہا۔

نصب العین فروغ کا حصول اسلام زندگی کے نصب العین فروغ کے حصول کی صورت میں ممکن تھا۔ یہ فروغِ حیات ظاہر میں بھی ہے اور باطن میں بھی۔ اس لئے فتح الدہر اور فتح الغیب ہر مومن کا نصب العین ہونا ہے قبلہ فرماتے ہیں کہ جس میں چھک کر کام کرنے، اپنی ذاتی صلاحیتوں کو کلی طور پر بروئے کار لانے کی فکر ہے۔ وہی زندہ کہلانے کا مستحق ہے۔ زندگی ہے ہی فروغ کا نام۔ اور بات کی مسلسل حیاتِ ابدی بھی اس کے ظاہر و باطن کے توازن یعنی توحیدی عمل پیرائی میں ہی پوشیدہ ہے۔ یہ قوم صرف شیرانہ زندگی گزار کر زندہ رہ سکتی ہے کہ شیر تر کا بہترین دفاع اس کا حملہ ہی ہوتا ہے اور وہی اس کی شہنشاہیت کی ضمانت بنتا ہے۔

مردِ حُ از کسِ نگیر در رنگ و بُو

مردِ حق از حق بگیر در رنگ و بُو

☆...☆...☆